شوکت صدیقی

(حالاتِ زندگی)

اُردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار شوکت صدیقی ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں الطاف حسین صدیقی کے ہاں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے مدرسہ فرقانیہ میں تیرہ پارے حفظ کیے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ بعد میں بی۔اے اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۰ء میں پہلے لاہور آئے؛ پھر کراچی آ کر صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور روزنامہ انجام اور روزنامہ مساوات کے مدیر رہے۔اس کے علاوہ متعدد دیگر اخبارات میں کام کیا۔ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے وابستہ رہے۔

شوکت صدیقی نے زندگی کا بغور مشاہدہ کیا۔ وہ عوام میں رہتے تھے اس لیے انہیں عوام کے دکھ درد کا بہ خوبی علم تھا۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں معاشرتی مسائل کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اُن کے اندازِ نگارش میں بے حد سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

اُن کی تحریروں میں بے ساختگی، نرمی، روانی اور سلاست جیسی صفات بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جذبے کی سچائی، صاف گوئی اور خلوص اُن کی تحریر کی نمایاں خوبی ہے۔ وہ ادب میں مقصدیت کے قائل تھے۔ اُن کی تحریروں میں کوئی نہ کوئی مقصد اور اصلاح کا پہلو ضرور موجود ہوتا ہے۔ اُن کی تحریروں میں جملے چھوٹے اور بامعنی ہوتے ہیں۔ ان کی بندش نہایت چست اور دل کش ہوتی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں حکومت پاکستان نے ادبی خدمات کے صلے میں انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔

شوکت صدیقی کی تحریروں میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی خوش بیانی کی وجہ سے ان کا طنز بھی خوشگوار ہوتا ہے۔ اُس میں تیز کاٹ نہیں ہوتی۔ وہ زبان کے لطف، واقعات اور محاورے کے استعمال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان کی شگفتگی، گھلاوٹ اور مزاحیہ رنگ سے ان کی تحریر میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے ۲۰۰۶ء میں کراچی میں وفات پائی۔

شریف آدمی

(شوکت صدیقی)

تدریسی مقاصد:

۱۔ طلبہ کو اُردو افسانے میں بیان کردہ مختلف سماجی مسائل سے واقفیت دلانا۔
۲۔ کسی بھی ادبی فن پارے میں مقصدیت سے روشناس کروانا۔
۳۔ شوکت صدیقی کے اسلوبِ نثر اور فنِ تکنیک سے آگاہ کرنا۔
۴۔ اُردو افسانوی ادب میں شوکت صدیقی کا مقام بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: انگڑائی لینا ۔ کسل مندی ۔ گوراچٹا ۔ وضع قطع ۔ کھیسیں ۔ تاؤ آنا ۔ جھجک محسوس کرنا
لقمہ دینا ۔ دن کٹنا ۔ مضمحل ۔ منہ بسورنا ۔ برتن مانجھنا

دوسرے روز وہ بستر پر پڑا دن چڑھے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ باہر صحن میں تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے رضائی کو ایک طرف پھینکا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر انگڑائی لے کر کسل مندی دور کرنے لگا۔ لیکن اِس مہینے کے ہر روز کی طرح، آج بھی اُس کے لیے دن کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا، اس کی بیوی دالان میں ایک طرف سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ تینوں بچوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صبح ہی صبح وہ باہر میدان میں کھیلنے نکل گئے تھے۔ اس نے سوچا اِس وقت بیوی سے بات کرنا مناسب نہیں، اِس لیے یہی بہتر ہے کہ پہلے وہ بچوں کو بلا کر گھر میں لے آئے اور جب ذرا چہل پہل ہو جائے تو پھر کوئی بات چیت کی جائے۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ بیوی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظریں ملیں؛ مگر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

دروازے ہی پر اس کو ڈپٹی صاحب کا ڈرائیور مل گیا۔ اس وقت وہ گہرے نیلے رنگ کی اُونی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ڈرائیوروں والی ٹوپی تھی۔ ڈرائیور کوئٹہ کا گوراچٹا نوجوان تھا۔ لمبا تڑنگا جسم، چہرے پر تازہ خون کی دَمک، وردی پہن کر وہ بڑا شان دار نظر آ رہا تھا اور اُس کے سامنے وہ خود کسی کیڑے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے اُس کو دیکھتے ہی اپنی بھاری آواز میں کہا:

''ماسٹر جی! السلام علیکم!''

وہ حقیر کیڑے سے ایک بارگی، باعزت آدمی بن گیا۔ اس نے لہجے میں ضرورت سے زیادہ شفقت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا، ''وعلیکم السلام۔ کہو میاں، گھر میں سب خیریت ہے۔ بال بچے اچھی طرح ہیں۔''

وہ کہنے لگا: ''سب اللہ کا شکر ہے، ماسٹر جی۔''

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اس کو ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب وہ ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے ہوں گے۔

ڈرائیور تیز تیز قدم اٹھاتا ڈپٹی صاحب کے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے پر کھڑا اُس کو میدان کے اُس سرے تک دیکھتا رہا؛ جہاں بہت سے بچے ہجوم کی صورت میں چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے اور ان سے ذرا فاصلے پر انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک آدمی کیمرہ لیے ان کا فوٹو لے رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سارا ہنگامہ کاہے کا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اِسی اثنا میں اس کو سامنے سے بجلی گھر کا مستری آتا ہوا نظر آیا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا، جب مستری قریب آ گیا تو اس نے پوچھا:

''یہ بچے اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں۔''

وہ کہنے لگا، ''میں بھی یہی دیکھنے گیا تھا۔ وہ جو کیمرہ لیے صاحب کھڑا ہے وہ بچوں کے سامنے چاکلیٹ، ٹافیاں اور پیسے پھینک رہا ہے اور جب بچے ان کو اٹھانے کے لیے جھپٹتے ہیں تو وہ جلدی سے ان کا فوٹو کھینچ لیتا ہے۔''

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا، ''فوٹو کھینچ لیتا ہے! کیوں؟''

مستری نے اس کی حیرت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے جواب دیا، ''پتہ نہیں۔ نہ جانے کیسا آدمی ہے، جب بچے اس کے قریب آ جاتے ہیں تو ان کو ڈانٹ کر دور کر دیتا ہے اور جب وہ چلاّتے ہیں تو کھیسیں نکال کر خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔ میں نے بچوں کے برابر کھڑے ہو کر سوچا تھا کہ لاؤ ایک فوٹو کھینچوا ڈالوں تو اُس نے انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دے کر مجھ کو الگ ہٹا دیا۔''

اُس نے جھٹ سے کہا، ''اور تم نے گالی سن لی۔''

وہ بولا، ''ہاں جی اور کیا کرتا؟''

ماسٹر جی کو، جو تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے تھے، مستری کی اِس بے حسی پر بڑا تاؤ آیا۔ اُن کا جی چاہا کہ وہ ابھی جا کر اُس کو اِس بُری طرح جھاڑیں کہ اُس کو بھی معلوم ہو جائے کہ اِس محلے میں مستری کی طرح سب بے حس ہی نہیں رہتے ہیں بلکہ کچھ شریف لوگ بھی بستے ہیں۔ مستری جیسے اِس بات کو تاڑ گیا تھا۔ اُس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ کہنے لگا:

''اچھا ہوا۔ اِس وقت آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میں کئی روز سے آپ کی تلاش میں تھا۔''

اُس نے گھبرا کر کہا، ''کیوں، خیریت تو ہے؟''

مستری آہستہ سے بولا، ''بات یہ ہے کہ......!'' کہتے کہتے وہ رُک گیا جیسے وہ اپنی بات کہنے میں جھجھک محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے اس جھجھک کو محسوس کرتے ہوئے فوراً سہارا دیا۔

''ہاں، ہاں کہو کیا بات ہے؟''

مستری کہنے لگا، ''بات یہ ہے کہ میری بیوی پچھلے کچھ دنوں سے بڑی بیمار ہے۔ اِس کا تو آپ کو بھی پتہ ہوگا۔''

اُس نے فوراً لقمہ دیا، ''ہاں! سنا تو ہے کہ تمہارے گھر والی آج کل علیل ہے۔''

مستری بتانے لگا، ''اِس لیے کھانے پکانے کی بڑی تکلیف ہے۔ آج کل گھر سے کچھ کھائے پیے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں۔ بچے الگ ستاتے ہیں۔ گھر والی کا حال یہ ہے کہ وہ تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوتی جارہی ہے۔ بڑی مشکل سے دن کٹ رہے ہیں۔''

اُنھوں نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا:

''بھئی تو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور لگ کر علاج کرو۔ اِس طرح کیسے کام چلے گا۔''

مستری کہنے لگا، ''علاج تو اُس کا ہورہا ہے۔ مگر اِس وقت سوال تو کھانے پینے کا اور گھر کی دیکھ بھال کا ہے۔'' اُس نے لمحہ بھر توقف کیا اور حرفِ مطلب پر آ گیا، ''میں نے سوچا آپ کا ہاتھ آج کل ذرا تنگ ہے۔ آپ کی گھر والی دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آجاتی ہے۔ تو اِس سے ہم دونوں کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ہرج نہ ہو تو وہ میرے گھر کی ذرا دیکھ بھال کرلیا کریں، کھانا تیار کردیا کریں۔ کوئی زیادہ کام نہیں ہے۔ اپنا ہی گھر سمجھ کر کام کردیا کریں۔ دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ میں آپ کو ۲۰ روپے مہینہ دے دیا کروں گا اور اِس کے علاوہ......!'' مگر اُس نے بات پوری کرنے سے پہلے ٹوک دیا۔

''اور اس کے علاوہ پھٹا پرانا کپڑا دے دیا کروں گا۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا'' غصے اور جذبات کی شدت سے اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''مستری! اللہ نے ہم پر وقت ڈالا ہے تو تم بھی جو چاہو کہہ لو۔ اللہ اللہ! اب یہ وقت آگیا ہے کہ ماسٹر فرزند علی کی بیوی، تمہارے گھر کے برتن مانجھے، ماما گیری کرے۔ واہ مستری واہ، خوب تم نے ہمدردی کی، خوب تم نے ہمسائے کا حق ادا کیا۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور مستری کے جواب کا انتظار کیے بغیر غصے سے کانپتے ہوئے اپنے گھر میں چلا گیا۔ مستری ہکا بکا ان کو کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

گھر میں جا کر ماسٹر فرزند علی نے دیکھا کہ بیوی اسی طرح دالان کے کونے میں سر جھکائے مضمحل بیٹھی تھی۔ وہ بے چینی سے کمرے کے اندر جا کر، دیوانے کتے کی طرح اِدھر اُدھر تیزی سے گھومتا رہا۔ پھر دالان میں آ گیا اور بیوی کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

''میں نے کہا سن رہی ہو شبن کی اماں۔ آئندہ اس مستری کے بچے کے دروازے پر تم نے قدم رکھا تو مجھ سے برا کوئی

نہیں ہوگا۔ خبردار! جو اَب تم اُس کے گھر گئیں......، بچوڑا کہیں کا۔"

وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا، پھر کمرے کی طرف چل دیا۔ بیوی نے ٹوک کر کہا، "کیوں آخر ہوا کیا؟" وہ رک کر کہنے لگا۔

"کچھ نہیں! کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے...... ابھی مجھ سے ملا تو کہنے لگا کہ تم اپنی بیوی کو میرے یہاں کھانا پکانے پر رکھ دو، حد ہو گئی......"

وہ بگڑ کر بولی، "اس کی ہمت کیسے ہو گئی۔ ابھی ابا جان سنیں تو یہی کہیں کہ پاکستان جا کر تم دونوں نے خاندان کا خوب نام روشن کیا۔ پیش کار صاحب کی بیٹی اب مستریوں کی خادمہ بنے گی۔ ان رذیلوں کی ٹہل چاکری کرے گی۔ خدا اس گھڑی کو موت نہ دے دے" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت کو رونے لگی۔ فرزند علی بھی اداس سا کمرے میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ گھر پر ایک سناٹا چھا گیا۔ دھوپ دیوار سے پھسل کر اب دالان تک آ گئی تھی۔ اس میں گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ فرزند علی بے حد اداس بیٹھا تھا۔ باہر دالان سے ابھی تک اُس کی بیوی کی دبی دبی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ فضا اتنی بوجھل اور بے کیف تھی کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک گھر کا دروازہ شور کرتا ہوا تیزی سے کھل گیا۔

اس کے تینوں بچے صحن میں آ کر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے۔ گھر کا سناٹا شکست ہو چکا تھا اور زندگی کے ہنگامے اداس فضا سے نکل کر بیدار ہو گئے تھے۔ جب بچوں کا شور زیادہ بڑھ گیا تو وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں لڑکے چھوٹی بچی کے ہاتھ سے کچھ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بچی جھکی ہوئی زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اُس نے اپنے ایک ہاتھ کو سینے سے چمٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دونوں بھائیوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی، جو بری طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ اب اُس کی بیوی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اُس نے ڈانٹ کر اُن کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر وہ اُن کے نزدیک چلی گئی۔ اُس نے دونوں کو زبردستی پکڑ کر الگ ہٹایا۔ بچی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں پر، بالوں پر، ہاتھ پیروں پر مٹی بھر گئی تھی۔ اُس نے اب رونا بند کر دیا تھا۔ پھر اس نے خوشی سے ہنس کر اپنا ہاتھ نکالا اور بھائیوں کی طرف بڑھا کر کہا، "لو یہ رہی" اور اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ مگر اس کا ہاتھ خالی تھا۔ لمحہ بھر تک تو وہ اپنی ہتھیلی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر منہ بسور کر رونے لگی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ وہیں مٹی میں لوٹ گئی۔ دونوں لڑکے خوشی سے تالیاں بجا کر ناچنے لگے۔

"اچھا ہوا، لے، چلی گئی نا، اب تو ہم یہ بھی نہیں دیں گے۔" انہوں نے اپنی جیب کے اندر سے خوب صورت کاغذوں میں لپٹی ہوئی چاکلیٹ نکالی اور ماں کے پاس سے دور بھاگ گئے، ماں پوچھنے لگی۔

"ارے کم بختو! یہ تو بتاؤ، اُس کے ہاتھ میں تھا کیا؟"

ایک بچہ کہنے لگا، "چونی تھی، صاحب نے ہم سب کو دی تھی۔ یہ اکیلی ہی اُس کو ہڑپ کر لینا چاہتی تھی، اب کھوگئی، اچھا

ہوا۔'' ماں نے جلدی سے کہا، ''تو وہ گئی کہاں؟'' اور پھر بچوں کی بات نظر انداز کر کے بچی کے پاس پہنچ گئی اور نظریں گڑا کر اِدھر اُدھر چونی تلاش کرنے لگی، ذرا دیر بعد بچی کے پاؤں تلے اُس کو مٹی میں دبی ہوئی چونی نظر آ گئی۔ اس نے چپکے سے اس کو اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا اور بچی کو اٹھا کر چمکارنے لگی، جو مٹی میں لتھڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ دروازے سے لگا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ کل دن بھر کی بھوک جو رات کے ہنگامے سے بجھ گئی تھی، پھر سلگنے لگی تھی۔ فرزند علی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اب وہ کہاں جائے، کیا کرے؟ باہر دالان میں بچوں کے چلانے اور اُس کی بیوی کے کوسنوں کی آوازیں سنائی پڑ رہی تھیں اور وہ ان آوازوں سے بے نیاز، صرف ایک ہی آواز کو سن رہا تھا، بھوک، بھوک، بھوک جو گھڑی کے پنڈولم کی طرح کھٹاک، کھٹاک، ہر ہر پل اور ہر ہر سکنڈ کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

اِسی لمحے اُس کی بیوی کمرے کے اندر آ گئی، ''لیجیے، یہ ذرا سے کچالو کھا کر پانی پی لیجیے، کچھ سہارا ہو جائے گا۔'' اُس نے گھوم کر دیکھا، بیوی کے ہاتھ میں رکابی تھی۔ جس میں اُبلے ہوئے آلوؤں کے تھوڑے سے قتلے تھے، جن پر نمک مرچ چھڑکا ہوا تھا۔ اُس نے بیوی سے نظریں ملائے بغیر چپ چاپ رکابی ہاتھ میں لے لی۔ بیوی باہر چلی گئی۔ اس نے آلو کا ایک قتلہ اٹھا کر منھ میں ڈال لیا، لیکن ابھی اُس نے چند ہی قتلے کھائے تھے کہ باہر آنگن میں اس کے خالہ زاد بھائی کی آواز سنائی دی۔ اُس نے رکابی اٹھا کر دیوار کے پاس ایک کونے میں چھپا دی اور جلدی جلدی منھ پونچھنے لگا۔ ذرا سی دیر بعد وہ اندر آ گیا۔ فرزند علی دیر تک اُس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت عرصے بعد آیا تھا۔ لہٰذا فرزند علی ہر ایک کے متعلق تفصیل سے پوچھ رہا تھا۔ آخر جب وہ اٹھ کر چلنے لگا تو فرزند علی نے اُس کو تکلفاً روکتے ہوئے کہا:

''بیٹھو میاں، چائے تو پیتے جاؤ۔''

شاید اُس کو ابھی کچھ دیر اور باتیں کرنا تھیں۔ اِس لیے وہ ٹھہر گیا۔ فرزند علی نے اونچی آواز میں بیوی سے کہا، ''سن رہی ہو! تم نے سمیع کے لیے چائے تیار نہیں کی؟ کیا کہیں گے کہ بھائی کے یہاں گیا تھا۔ چائے تک کو نہ پوچھا۔'' اس نے خواہ مخواہ خوش مزاج بننے کی کوشش کی۔ اُس وقت دروازے کی آڑ سے اُس کی بیوی کا چہرہ نظر آیا وہ ناراضگی سے اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے گردن موڑ لی اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ آخر جب وہ پھر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا تو فرزند علی نے اُس کو روک کر کہا، ''چائے تو پیتے جاؤ! نہ معلوم اتنی دیر کیوں ہو گئی۔'' اور خود اٹھ کر باہر دالان میں آ گیا۔ بیوی کے قریب جا کر اُس نے کہا، ''چائے کا تو بندوبست کر دو۔ سمیع کو تو تم جانتی ہی ہو، خالہ سے جا کر کہے گا۔ صاحب! فرزند علی بھائی کے یہاں گیا تھا۔ ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔''

بیوی جل کر بولی، ''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بچی کی چونی لے کر تو آلو منگائے تھے۔ میرے پاس کچھ آپ نے جمع کرا دیا ہے کہ چائے کا انتظام کر دوں۔''

فرزند علی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا، پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا، ''مستری کے یہاں سے لے آؤ۔''

وہ حیرت سے بولی، ''مستری کے یہاں سے؟ آج ہی تو آپ نے منع کیا تھا۔ میں تو اس کے یہاں اب تھوکنے کی بھی نہیں۔'' وہ اس کو منانے لگا۔ ''سنو تو، کہنا، ہم جلد ہی تمہارا سارا قرض ادا کر دیں گے اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں۔ مسلم اسکول کے سکریٹری نے آج مجھے بلایا بھی ہے۔'' مگر وہ آمادہ نہ ہوئی۔

''وہ تو روز بلاتا ہے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔'' پھر اُس نے خوشامد کے سے انداز میں کہا، ''خدا کے لیے مجھ کو وہاں نہ بھیجیے۔ مجھے کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ پھر آج تو آپ سے اس کا جھگڑا بھی ہو گیا ہے۔''

فرزند علی خاموش ہو کر انگلی سے اپنے بالوں کو کریدنے لگا۔ اتنے میں سمیع نکل کر باہر دالان میں آ گیا کہنے لگا، ''نہیں بھائی صاحب آپ چائے کا تکلف نہ کیجیے، خواہ مخواہ بھابی کو تکلیف ہوگی۔'' اور وہ روٹھا ہوا سا گھر سے باہر چلا گیا۔ فرزند علی نے اُس کو روکا بھی مگر وہ واپس نہ لوٹا۔ اُس نے مڑ کر اِس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

فرزند علی جب پھر کمرے میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ رکابی خالی پڑی تھی۔ اُس کی غیر حاضری میں بچوں نے اس کو صاف کر دیا تھا۔ غصے سے اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بچوں کو اِس کا پہلے ہی علم تھا، اس لیے وہ گھر سے غائب ہو چکے تھے۔ اُس نے جھنجلاہٹ میں رکابی اٹھا کر باہر آنگن میں پھینک دی اور اپنے ٹرنک کو کھول کر تمام کپڑے الٹ پلٹ کر رکھ دیے۔ پھر اُس نے سرج کی شیروانی نکالی۔ اُس کو پہنا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ بیوی نے اس کو باہر جاتے ہوئے دیکھا، مگر شیروانی کو دیکھ کر اس کو تعجب ضرور ہوا۔ اس لیے کہ فرزند علی، اس شیروانی کو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا اور اس کو بڑی حفاظت کے ساتھ رکھتا تھا۔ جب کبھی وہ اس کو پہنتا تو بیوی کے سامنے اس طرح اِترا اِترا کر چلتا کہ اس کا ہر انداز چیخ چیخ کر کہتا، ''دیکھو کیسا جچ رہا ہوں کیا ٹھاٹھ ہیں اپنے۔'' بلکہ ایک بار وہ اپنے اسکول کی کسی تقریب سے لوٹ کر آیا، تو بار بار اس کو ہنسی آ رہی تھی۔ بیوی نے پوچھا تو کہنے لگا، ''آج تو بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسکول کے جلسے میں جو بھی آتا، وہ مجھ کو ہیڈ ماسٹر سمجھتا، پہلے مجھ سے ہی بڑھ کر مصافحہ کرتا۔ ہیڈ ماسٹر جل بھن کر رہ گیا۔'' وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ شیروانی کی شان میں قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ مگر آج اِس شیروانی کو کیوں نکالا گیا۔ پھر اُسے خود ہی خیال آ گیا کہ مسلم اسکول کے سکریٹری سے ملنے گئے ہوں گے اور اِس احساس نے اس کو امید اور نا اُمیدی کے دوراہے پر لا کر چھوڑ دیا۔

فرزند علی گھر سے نکل کر پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی دکان پر پہنچا۔ آنے کو تو وہ اس بازار میں آ گیا۔ مگر کسی

دکان میں داخل ہونے کی اُس کو ہمت نہ ہوئی۔ آخر وہ ایک دکان پر، جہاں بالکل سناٹا تھا، اللہ کا نام لے کر اندر چلا گیا۔ دکان میں الماریوں کے اندر ہینگروں پر، دیواروں پر ہر جگہ انگریزی وضع کے لباس ٹنگے تھے، بعض تو ایسے اعلیٰ درجے کے سلے ہوئے تھے کہ اس کو اپنی شیروانی بے حد گھٹیا معلوم ہونے لگی۔ دکان دار اُٹھ کر اُس کے پاس آیا۔

''کیا چاہیے؟'' پر اس نے خود ہی کہا، ''کوٹ دکھاؤں، کوئی سوٹ؟ ہمارے یاں جو نیا مال آیا ہے اُس میں تو ایسے ایسے کوٹ ہیں کہ نیا اس کے سامنے شرما جائے۔ خاص امریکہ کے تیار کیے ہوئے کپڑے ہیں۔''

فرزند علی نے جھجکتے ہوئے کہا، ''آپ کے یہاں شیروانیاں نہیں ہوتیں؟''

دکان دار مسکرانے لگا، ''نہیں صاحب! شیروانیاں کیسے ہوسکتی ہیں۔ یہ سب کپڑے تو امریکہ سے آئے ہیں۔''

فرزند علی کہنے لگا، ''شیروانی اور اِس قسم کے کپڑے آپ اپنے یہاں سے خرید لیا کیجیے۔''

دکان دار اونچی آواز میں بولا:

''ارے صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ امریکہ میں تو ہر سیزن میں کپڑے آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتے ہیں۔ وہاں ہر سال فیشن بدلتا ہے۔ نئے کے نئے کپڑے ایک دم کنڈم کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں تو لوگ دس دس سال ایک کپڑے کو رگڑتے ہیں۔ اب اِس اپنی شیروانی کو دیکھ لیجیے۔ سات آٹھ سال سے کم کی کیا بنی ہوگی۔ ایسے کپڑے لے کر دکان پر لگائے جائیں؛ تو آپ ہی بتائیے کون اِن کو خریدنے آئے گا؟'' فرزند علی جل بھن کر رہ گیا۔ اپنی شیروانی کی وہ اس قدر ہتک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اِسی اثنا میں دکان کے اندر ایک گاہک آ گیا۔ دکان دار اُسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لہٰذا فرزند علی پیچ وتاب کھاتا ہوا دکان سے باہر آ گیا۔ کسی اور دکان پر جانے کی اُس کو ہمت نہ پڑی۔

شام کو جب لوٹا تو گھر میں اندھیرا پڑا تھا، بچے چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ بیوی حسبِ معمول ان کو کوسنے دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ جا کر پلنگ پر بیٹھ گیا آخر تھوڑی دیر بعد بیوی نے آ کر پوچھا:

''سیکرٹری صاحب سے کچھ بات ہوئی۔''

وہ اُس کو مایوس نہ کر سکا، ''پرسوں پھر بلایا ہے۔''

وہ بولی، ''تو کچھ امید ہے۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں'' اس نے جھوٹ موٹ کی امید بندھوا دی۔

اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اُس نے شیروانی اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور مضمحل سا بستر پر لیٹ گیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر تک بے چینی سے

دالان میں ٹہلتا رہا۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد، اُس نے کمرے میں آکر شیروانی پہنی۔ بڑے لڑکے کو اٹھایا وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ کیروسین آئل کی بوتل اُس کو دی اور اپنے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔ بیوی نے خامشی سے سب کچھ دیکھا، مگر وہ کچھ بولی نہیں، چپ چاپ لیٹی رہی۔

باہر آکر وہ سیدھا محلے کے پرچونیے کی دکان کی طرف چل دیا۔ سردی کی وجہ سے سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ دکان پر اُس وقت سوائے دکان دار کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ فرزند علی کہنے لگا:

''خان صاحب تم نے ابھی تک دکان نہیں بڑھائی۔''

وہ کہنے لگا، ''بس بند کرنے ہی جارہا تھا۔ آج سردی بھی کچھ زیادہ ہے۔''

فرزند علی نے کہا، ''ہاں آج سردی زیادہ ہے، تمہارا کیا ہے بھائی، تم تو، سنا ہے کہ آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔'' وہ خواہ مخواہ اُس سے بے تکلفی برتنے لگا۔

''صحت بھی ماشاء اللہ ادھر اچھی ہوگئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خان صاحب تم پر تو پھر سے جوانی آگئی ہے۔'' فرزند علی یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ دکان دار بھی مسکرا دیا۔

''ماسٹر جی، کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچوں کا پیٹ پال لیتا ہوں۔''

فرزند علی جھٹ سے بولا، ''ہاں بھئی تمہاری ہمت پر آفرین ہے۔ اکیلے دم پر اتنا بڑا ٹبر سنبھالے ہوئے ہو۔'' پھر اُس نے فوراً ہی بات کا رُخ بدل کر کہا، ''ذرا ایک بوتل مٹی کا تیل تو دینا'' اور لڑکے سے بوتل لے کر اُس کی طرف بڑھا دی۔ دکان دار نے بوتل میں تیل بھر دیا۔

فرزند علی نے بوتل لڑکے کو دے کر کہا، ''اچھا تم چلو۔ امی سے کہنا میں ابھی آتا ہوں۔'' لڑکا گھر کی طرف چل دیا۔ وہ دکان دار سے کہنے لگا، ''اِس کے پیسے کل آجائیں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ......'' دکان دار نے فوراً اُس کو ٹوک دیا۔

''ماسٹر جی، اِس طرح کام نہیں چلے گا۔''

وہ زبردستی ہنسنے لگا، ''اماں اس طرح بھی کام چلتا ہے۔'' اُس نے پھر بات بدلنے کی کوشش کی۔ ''ہاں تو......'' دکان دار نے پھر اس کو ٹوکا:

''نہیں جی! قرض میں نے بالکل بند کر دیا ہے۔ لڑکے کو بلا لیجیے۔'' اُس نے فرزند علی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر واپس بلالیا۔ اس سے بوتل لی اور کنستر میں تیل انڈیل کر خالی بوتل اس کو تھما دی۔ بچہ سہما ہوا سا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ فرزند علی جھینپ مٹانے لگا۔ ''خان صاحب! بعض وقت تم تو ایسی بے مروتی پر اتر آتے ہو کہ بالکل مارواڑی

معلوم ہونے لگتے ہو۔ اماں تمہارے پیسے لے کر یہاں سے بھاگنے سے تو رہا۔''

مگر خان صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر دکان بند کرنے کے واسطے قفل نکالنے لگا۔ فرزند علی ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دکان سے ہٹ آیا۔ لڑکے کو اُس نے گھر بھیج دیا اور خود دودھ والے کی دکان کی طرف چل دیا۔ اس لیے کہ گھر کے اندھیرے سے اُس کو وحشت ہو رہی تھی۔

دودھ والے کی دکان پر ایک دھندلی سی لالٹین جل رہی تھی اور کئی آدمی بیٹھے دودھ پی رہے تھے۔ فرزند علی بھی وہاں پہنچ گیا، ''کہو بھئی پہلوان کیا حال ہے؟''

وہ کہنے لگا، ''ماسٹر صاحب سب خدا کا شکر ہے۔''

''ہاں میاں، ہر حال میں اُس کا شکر ادا کرنا چاہیے وہ بڑی شان والا ہے۔''

دودھ والا اپنی بات کہہ کر فوراً کام میں مصروف ہو گیا۔ فرزند علی وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے کچھ دیر بعد اٹھ کر چل دیے۔ اب دکان پر سناٹا ہو گیا تھا۔ پہلوان کے علاوہ دکان میں سامنے پلنگ پر ایک شخص رضائی اوڑھے پڑا سو رہا تھا۔ ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر دکان دار کہنے لگا:

''ماسٹر صاحب، اب کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔''

وہ بولا، ''ہاں بھئی، برکت رہے بھی تو کیسے؟ لوگوں کی اب وہ نیتیں نہیں رہیں۔ وہ ایمان نہیں رہے۔''

دکان دار کہنے لگا، ''بالکل ٹھیک کہا آپ نے یہی حال ہو رہا ہے۔'' پھر وہ دکان داری کے خراب ہونے کا رونا رونے لگا۔ ''اب کیا بتاؤں آپ سے کہ کس طرح دکان داری چلتی ہے۔ لوگوں کو کھانے کو تو میسر نہیں۔ بے چارے دودھ کہاں سے پییں۔''

فرزند علی نے باتوں میں دل چسپی لینا شروع کر دی۔ ''عجیب زمانہ آیا ہے، ایسا تو کبھی دیکھا اور نہ خدا دکھائے۔ ایک یہ وقت ہے، ایک وہ زمانہ تھا، خدا بخشے والد مرحوم زندہ تھے۔ گھر پر بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ گابھن ہوئی تو گاؤں بھجوا دی۔ دوسری بلوا لی۔ دونوں وقت میں ۳۵ سیر تک دودھ دیا ہے ہماری بھینسوں نے۔ ابا جان زبردستی سر پر سوار ہو کر دودھ پلواتے تھے، جہاں ان کی نظر بچی اور میں نے جھٹ سے کٹورا اوندھا کر دیا۔ اماں تم کو تعجب ہوگا۔ ہمارے آنگن کا فرش کچا تھا۔ جہاں میں دودھ ڈالتا تھا وہاں کی زمین ایسی چکنی ہو گئی تھی کہ نچوڑو تو چکنائی ٹپک پڑے۔'' پہلوان کہنے لگا، ''کیوں نہیں ماسٹر صاحب، کیوں نہیں۔ اُس دودھ کی کیا بات تھی۔''

فرزند علی جیسے اس کو مرعوب ہی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کہنے لگا، ''سستا زمانہ تھا۔ دو روپے میں نوکر مل جاتا تھا۔ گھر میں،

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو، کوئی درجن بھر ملازم ہوں گے۔ پوری پلٹن تھی۔ اس خیال سے کہ ابا جان ہم کو دودھ نہ پلا دیں، چپکے چپکے ان کو گلاس بھر بھر کر پلا دیتے تھے...... پھول پھول کر مکھنا ہاتھی ہو گئے تھے۔''

پہلوان نے بات کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ دودھ نکالنے کی ڈونگی اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔ وہ اس کو اٹھانے کے لیے دوسری طرف جھک گیا۔ فرزند علی کی طرف سے اُس کی پیٹھ تھی۔ اچانک اُس کی نظر لکڑی کے اس ڈبے پر پڑ گئی جو کھلا ہوا تھا۔ اُس میں کچھ ریز گاری، چند روپے اور ایک دس والا نوٹ پڑا تھا۔ فرزند علی نے لمحہ بھر تک اُس طرف دیکھا اور پھر بلی کی طرح چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر اُس نے نوٹ اٹھالیا۔ اُسی وقت دودھ والا پہلوان دودھ کی ڈونگی اٹھا کر اپنی جگہ آ گیا۔ فرزند علی نے گھبرا کر نوٹ شیروانی کی نچلی جیب میں ڈال لیا۔

دودھ والے نے اُس کے چہرے کا رنگ متغیر دیکھا تو کہنے لگا، ''کیوں ماسٹر صاحب کیا ہو گیا؟''

فرزند علی کہنے لگا، ''کچھ نہیں بھئی، بیٹھے بیٹھے پیٹ میں مروڑ سی معلوم ہوئی۔ خدا خیر کرے۔'' ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر چلنے لگا۔ پہلوان کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ گلّے سے روپے نکال کر گننے لگا۔ پھر خود ہی بولا، ''یہ دس کا نوٹ کیا ہو گیا۔'' فرزند علی اور گھبرا گیا۔ اس نے سوچا اب یہاں سے کھسک جانا ہی بہتر ہوگا۔ اس نے اپنے خالی پیٹ کو خواہ مخواہ زور سے دبوچ لیا، ''بھئی بڑی تکلیف ہو رہی ہے میں تو چلا۔'' دودھ والے نے جیسے سنا ہی نہیں۔ نوٹ کے غائب ہو جانے سے وہ بے حد پریشان ہو رہا تھا۔

اتنے میں پلنگ پر لیٹا ہوا آدمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پوچھنے لگا:

''چاچا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

وہ کہنے لگا، ''ایک دس کا نوٹ جانے کہاں چلا گیا۔'' اس کا بھتیجا بھی اٹھ کر وہاں آ گیا۔ فرزند علی اب دکان سے آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

ابھی چند قدم ہی وہ چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ کر کہا، ''ذرا اِدھر آنا جی۔'' فرزند علی نے گھوم کر دیکھا، پہلوان کا بھتیجا اس کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا:

''چاچا نوٹ یہ رہا۔''

اس نے فرزند علی کی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا۔ وہ ہوا یہ کہ گھبراہٹ میں اُس نے نوٹ اس طرح رکھا تھا کہ جیب میں اسے اس کا ایک سرا دکھائی دے رہا تھا۔ دکان دار کو فرزند علی پر ایک دم غصہ آ گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو کر دکان سے نیچے کود پڑا اور جاتے ہی اس نے فرزند علی کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل گر پڑا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا

ہو گیا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کی آواز اس قدر بھرائی ہوئی تھی کہ منہ سے بول نہیں پھوٹ رہا تھا۔ لیکن پہلوان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے لپک کر اُس کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دینے لگا۔ فرزند علی کہنے لگا:

''اماں گریبان تو چھوڑو۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔''

پہلوان نے اُس کے منہ پر گُس کے تھپڑ مارا اور چیخ کر بولا، ''شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے۔'' فرزند علی نے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا، ''اچھا میرا گریبان تو چھوڑو۔ شیروانی کا کالر خراب ہو جائے گا۔'' دودھ والے نے اِس زور کا جھٹکا دیا کہ شیروانی کندھے پر سے پھٹ کر کمر تک آ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر اُس کو مارنا شروع کر دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا:

''...... چور! مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔ تو اسی لیے اتنی رات کو دکان پر آیا تھا۔'' فرزند علی آہستہ آہستہ بول رہا تھا، ''تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ تمہارا نوٹ مل گیا۔ اب مجھ کو چھوڑ دو۔ تم نے اتنا مار بھی لیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو۔'' مگر پہلوان ذرا بھی متاثر نہ ہوا کہنے لگا:

''میں تجھ کو تھانے لے جاؤں گا...... تجھ کو یوں نہیں چھوڑوں گا۔''

شور سن کر پاس پڑوس کے بہت سے لوگ نکل کر وہاں اکٹھا ہو گئے۔ پہلوان نے اب اُس کی قمیص کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ فرزند علی بار بار کہہ رہا تھا کہ، ''میری بات تو سنو۔'' اتنے میں ایک شخص آ گیا۔ جو کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اُس کو فرزند علی کی حالت پر ترس آ گیا۔ اس نے پہلوان سے ڈانٹ کر کہا:

گریبان تو چھوڑو۔''

پہلوان نے گریبان چھوڑ دیا۔ وہ آدمی فرزند علی سے کہنے لگا، ''پہلے آپ بتائیے کہ بات کیا تھی؟''

فرزند علی کہنے لگا، ''صاحب میں شریف آدمی ہوں۔ یہ بدمعاش لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ مجھ پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھیے، میری اتنی اعلیٰ شیروانی بھی پھاڑ ڈالی اور برابر مار پیٹ رہے ہیں۔'' وہ مسکین بنا ہوا جھوٹ موٹ کی صفائی پیش کرنے لگا۔'' خدا کی قسم، میں نے اس کا نوٹ دیکھا تک نہیں۔'' پہلوان کا بھتیجا ایک دم چیخ کر بولا:

''او سور کے بچے! جھوٹے۔ ابھی تو تیری جیب سے نوٹ نکالا ہے۔''

اُس کے جھوٹ بولنے پر پہلوان کو پھر غصہ آ گیا۔ وہ اُس کو موٹی موٹی گالیاں دینے لگا۔ اس نے پھر جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور فرزند علی کے حمایتی کی طرف آنکھیں نکال کر بولا، ''دیکھیے بابو جی! آپ اس معاملے میں نہ بولیے ورنہ بات بڑھ جائے گی۔''

بے چارے بابو جی پہلوان کی خوں خوار آنکھوں سے سہم کر رہ گئے، وہ بات کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اور مجمع سے کھسک کر

پیچھے آ گئے۔ پہلوان کو اِس بات کی ضد تھی کہ وہ فرزند علی کو تھانے لے جائے بغیر باز نہیں آئے گا۔ اتنے میں کسی نے ہجوم میں سے چیخ کر کہا:

''پہلوان تھانے لے جا کر کیا کرو گے۔ دس بیس جوتے مار کر چھوڑ دو...... بال بچے والا ہے، یہ تو جیل چلا جائے گا۔ وہ بے چارے بھوکے مریں گے۔''

پہلوان اِس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ اتنے میں اسی آدمی نے، جس نے یہ مشورہ دیا تھا، جوتا اتارا اور دھڑا دھڑ جوتے مارنا شروع کر دیے۔

فرزند علی چیختا رہا، ''میری بات تو سنو، میں شریف آدمی ہوں۔'' مگر وہاں کون اس کی سنتا تھا۔ وہ قسمیں کھاتا رہا۔ اپنی بے گناہی ثابت کرتا رہا۔ مگر جوتے دھڑا دھڑ پڑتے رہے۔ پھر اُس آدمی نے ہانپنے کے سے انداز میں ہاتھ روک کر کہا، ''اچھا اب اس کو جانے دو۔'' اور وہ فرزند علی کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کی بھیڑ میں سے باہر نکال لایا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا:

''کہو استاد کیسا صاف بچوا دیا۔ ورنہ ابھی حوالات میں ہوتے۔ تم شریف آدمی ہو۔ اِسی کو غنیمت جانو۔''

فرزند علی کو اِس پر بے حد غصہ آیا مگر وہ کرتا بھی کیا۔ چپ چاپ شریف آدمی کی طرح اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر میں جا کر اُس نے دیکھا کہ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور بیوی جاگ رہی تھی۔ اُس کی پھٹی ہوئی شیروانی اور بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر بولی:

''ہے ہے! کیا ہو گیا۔ کسی سے لڑ کر آئے ہو؟ شور تو میں نے بھی سنا تھا۔''

وہ خشمگیں نظروں سے گھور کر بولا، ''کچھ نہیں ہوا۔''

وہ اصرار کرنے لگی، ''کچھ تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟''

وہ بگڑ کر بولا، ''یہ روشنی کمرے میں کیسے ہو رہی ہے؟ تم پھر اُس خبیث مستری کے یہاں گئی تھیں۔ میں نے ہزار دفعہ سمجھا دیا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ مگر تم ذات کی ڈومنی ہو ڈومنی۔ کمین خصلت کہیں جا سکتی ہے۔'' وہ اس پر برس پڑا۔

وہ خوشامد کے سے انداز میں بولی، ''اُس کے یہاں کب گئی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد، بچے سب جاگ اٹھے تھے۔ ان کو بہلانے کے لیے کلب کی طرف لے گئی تھی۔ وہاں آج کوئی بڑا جشن تھا۔ بڑی بھاری دعوت تھی، خوب روشنی ہو رہی تھی، بینڈ بج رہا تھا، عورتیں اور مرد مل کر ناچ رہے تھے۔'' وہ بچوں کی طرح ایک ایک بات تفصیل سے مزا لے لے کر بتا رہی تھی۔

''وہیں کوڑے کے بڑے ٹین میں سے یہ بچے نہ جانے کیسے ایک موم بتی ڈھونڈ لائے۔ اُسی کو میں نے جلا دیا۔''

فرزند علی خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا اور فرش پر پڑے ہوئے ایک ٹوسٹ کے ٹکڑے کو دیکھ کر بولا، ''اور وہیں

کوڑے گھر سے، لوگوں کے بچے کچے کھانے کو بھی اٹھالائیں۔ میں کہتا ہوں، تم کیوں میری عزت کے پیچھے پڑی ہو۔ دنیا میں ایسی بھی عورتیں ہیں۔ جن پر سات سات وقت کا فاقہ پڑتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور ایک تم ہو۔''

بیوی کی...... چوری پکڑ لی گئی تھی۔ وہ جھنجھلا کر بولی، ''تو آخر میں کیا کروں ان...... نے میری بوٹیاں نوچنی شروع کر دی تھیں۔'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ فرزند علی کو اُس کا اِس طرح رونا بہت برا لگا۔ اُس نے غصے میں اُس کے بال پکڑ کر اِس زور سے کھینچے کہ وہ فرش پر منہ کے بل گر پڑی۔ فرزند علی اس وقت واقعی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی کمر پر اور پیٹھ پر جوتوں کی ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ شور سن کر بچے بھی جاگ اٹھے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ فرزند علی نے چیخ کر کہا، ''چپ ہو جاؤ، سور کے بچو۔'' مگر دو سور کے بچے تو ڈانٹ سے خاموش ہو گئے۔ البتہ سور کی بچی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ فرزند علی نے جھنجھلا کر اس کے منہ پر اس زرور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑھکتی ہوئی بستر کے دوسرے کنارے تک چلی گئی اور خوف زدہ ہو کر اس کو دیکھنے لگی، فرزند علی لحہ بھر تک گھورتا رہا۔ پھر جیسے اس کو خود ہی اپنی حالت پر ترس آ گیا۔ وہ وحشیوں کی طرح پلٹا اور دیوار پر سر دے مارا۔ ''اور لو اور لو، اور لو'' وہ دیوانوں کی طرح دیوار پر ٹکریں مارتا رہا۔ پیشانی پر سے اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہتا ہوا اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ دھندلی روشنی میں خون سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ بے حد خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ بچے چیخ کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ لیکن فرزند علی اس طرح زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے پیر کانپنے لگے تھے اور پھر وہ نڈھال ہو کر فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں گھور اندھیرا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہے۔ وہ دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہو چکا تھا اور پیٹ میں آگ سی لگ رہی تھی۔

(راتوں کا شہر)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شریف آدمی نے کسل مندی کیسے دُور کی؟

ب) بچے صبح ہی صبح کہاں چلے گئے تھے؟

ج) مستری کچھ کھائے پیے بغیر ڈیوٹی پر کیوں جا رہا تھا؟

د) فرزند علی اپنے خالہ زاد بھائی کو چائے کیوں نہ پلا سکا؟

ہ) ماسٹر کی بیوی نے خاوند کو کھانے کے لیے پلیٹ میں کیا دیا؟

و) ہیڈ ماسٹر کیوں جل بھن کر رہ گیا تھا؟

ز) امریکہ میں کپڑے ہر سیزن میں کیوں آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتے ہیں؟

ح) ہجوم میں موجود شخص نے فرزند علی کو حوالات جانے سے کیسے بچایا؟

۲۔ سبق کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

الف) فرزند علی کے............... بچے تھے۔ (تین ۔ پانچ ۔ سات)

ب) فرزند علی پیشے کے اعتبار سے............... تھا۔ (ٹیچر ۔ ہیڈ ماسٹر ۔ پروفیسر)

ج) پہلوان نے فرزند علی کا............... پکڑا۔ (گریباں ۔ بازو ۔ دامن)

د) فرزند علی نے دس روپے کا نوٹ............... کی جیب میں چھپالیا۔ (شیروانی ۔ قمیص ۔ واسکٹ)

ہ) بچہ............... ہوا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ (گھبرایا ہوا ۔ ڈرا ہوا ۔ سہما ہوا)

و) بیٹھو میاں!............... پیتے جاؤ۔ (شربت ۔ چائے ۔ پانی)

ز) آنگن میں............... بھائی کی آواز سنائی دی۔ (پھوپھی زاد ۔ چچازاد ۔ خالہ زاد)

ح) بھئی! تو کسی اچھے............... کو دکھاؤ اور لگ کر علاج کرو۔ (طبیب ۔ حکیم ۔ ڈاکٹر)

۳۔ سبق کے مطابق درست کے نشان (✓) اور غلط کے (✗) سے کریں۔

الف) فرزند علی پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔

ب) ڈرائیور کوئٹہ کا گورا چٹا نوجوان تھا۔

ج) انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک آدمی کیمرہ لیے ان کا فوٹو لے رہا تھا۔

د) ماسٹر جی بہت اچھی انگریزی بول لیتے تھے۔

ہ) آپ کی گھر والی دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آجاتی ہے۔

و) بیوی بولی! بچی کی چونی لے کر تو آلو منگائے تھے۔

ز) فرزند علی نے شیروانی اتار کر صندوق میں بند کر دی۔

ح) فرزند علی نے دکاندار سے کہا "تم آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔

۴۔ ذیل تراکیب/محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔
دن کٹنا ۔ ہرج نہ ہونا ۔ لقمہ دینا ۔ تاؤ آنا ۔ کھیسیں نکالنا ۔
کروٹیں بدلنا ۔ سناٹا چھا جانا ۔
آواز بھر آنا ۔ پیچ و تاب کھانا ۔ منہ بسورنا ۔ سسکیاں بھرنا ۔ ڈھاک کے تین پات

۵۔ فرزند علی کی شخصیت پر مختصر روشنی ڈالیں۔

۶۔ بحوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔
گھر میں بالکل سناٹا تھا.......... پھر کوئی بات چیت کی جائے۔

۷۔ افسانہ ''شریف آدمی'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۸۔ افسانہ ''شریف آدمی'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۹۔ افسانہ ''شریف آدمی'' میں مصنف نے جن سماجی مسائل کی نشاندہی کی ہے انھیں مختصر بیان کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے معاشرتی و عملی زندگی کے مسائل کے حوالے سے ان کے جذبات و خیالات اور مافی الضمیر کے اظہار کے حوالے سے مضمون تحریر کروائیں اور ان سے اس کا زبانی اظہار بھی کروائیں۔

۲۔ طلبہ سے کوئی اخباری مواد یعنی نیوز سٹوری یا آرٹیکل وغیرہ تحریر کروائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو افسانے کے تدریجی ارتقا سے آگاہ کریں۔

۲۔ اُردو افسانے میں مختلف رجحانات کے بارے میں بتائیں۔

۳۔ شوکت صدیقی کے اسلوبِ تحریر پر لیکچر دیں۔

۴۔ اُردو افسانوی ادب میں شوکت صدیقی کا مقام بتائیں۔